یونیفارم سول کوڈ مسلم پرسنل لا

اور

عورت کے حقوق

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

شائع کردہ:

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

76A/1، مین بازار، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

(© جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

نام کتاب	:	یونیفارم سول کوڈ، مسلم پرسنل لا بورڈ اور عورت کے حقوق
مصنف	:	مولانا محمد برہان الدین سنبھلی
طبع اول	:	جنوری ۱۹۹۶ء
طبع دوم	:	۲۰۱۱ء
تعداد	:	ایک ہزار
کمپوزنگ	:	محمد ارشد عالم ندوی
پروف ریڈنگ	:	محمد وقار الدین لطیفی ندوی
صفحات	:	۴۴
قیمت	:	50 روپے

ناشر

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ-نئی دہلی

فہرست

مقدمہ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ۵

پیش لفظ از مصنف ۱۰

یونیفارم سول کوڈ اور مسلم پرسنل لا ایک جائزہ ۱۳

یونیفارم سول کوڈ کیا ہے؟ ۱۴

مسلم پرسنل لا کسے کہتے ہیں؟ ۱۴

یکساں سول کوڈ کا مطلب ۱۵

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا پس منظر ۱۷

اسلامی قوانین میں.....(غیر مسلموں کا اعتراف) ۱۸

وراثت ۱۹

قانونِ طلاق ۲۱

سبق آموز ۲۳

تعدد ازدواج ۲۴

آخری بات ۲۶

شریعت کے ازدواجی قوانین میں عورتوں کے حقوق ۲۸

قرآن وسنت میں نکاح سے متعلق احکام کی تفصیلات ۲۸

ایک فریق کا عقدِ نکاح میں نازک ہونا ۳۰

خطبۂ نکاح میں حکمت؟ ۳۱

پردہ، عورت کی فطرت کا تقاضا ۳۲

اخراجات کا عورت پر کوئی بار نہیں ۳۲

منافع ذمہ داریوں سے وابستہ ۳۳

ترکہ میں عورت کا حصہ کم کیوں؟ ۳۵

تعجب کی بات ۳۶

شوہر پر بیوی کے حقوق ۳۶

اسوۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ۳۷

عورت کی رعایت ۳۸

ایک بے نظیر حکم ۳۹

اسلام کا ایک حکیمانہ اصول ۴۰

زوجین کے روابط کی بلیغ تمثیل ۴۱

لڑکی کے بارے میں زمانہ جاہلیت اور اسلام میں فرق ۴۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ.

باخبر قارئین کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کا عائلی قانون (جس میں نکاح و طلاق وراثت اور بیوی کے نان ونفقہ وغیرہ کے احکام پر مسائل شامل ہیں اور اس کو عربی میں ''**قانون الاحوال الشخصیة**'') کہتے ہیں، میں ترمیم اور حذف واضافہ کی تحریک، ہندوستان کی آزادی کے کچھ عرصہ کے بعد سے ملک میں چل رہی ہے، اس کا کھلا ہوا نتیجہ (کم سے کم مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے) مداخلت فی الدین، بلکہ دین کے واضح، صریح، متفق علیہ اور کتاب اللہ سے ثابت احکام پر عمل کرنے کو ناممکن بنادینے کے مرادف ہے، اور جیسا کہ ہر ذی علم کو معلوم ہے کہ اسلام صرف عقائد وعبادات کا مجموعہ نہیں، اس کے احکام و تعلیمات میں اور اس کے فرائض، واجبات اور محرکات وممنوعات میں ازدواجی زندگی کے احکام، فرائض وواجبات اور صرف مکروہات ہی نہیں، بلکہ ممنوعات ومحرمات بھی شامل ہیں، اور ان پر عمل نہ کرنے سے ایک مسلمان گنہگار اور قصوروار ہوتا ہے، اور اس سے آخرت میں محاسبہ ومؤاخذہ ہوگا، اور ان کے انکار کردینے سے وہ خارج از اسلام ہوجاتا ہے، اور اس پر ارتداد کا حکم لگایا جاسکتا ہے۔

ایسی صورت میں جب کہ کسی ملک میں آزادی اور قانون سازی کا حق کسی ایسی جماعت کو حاصل ہوجاتا ہے، جو وہاں عددی طور پر اکثریت میں ہے، اور فرقہ وارانہ تعلیم و تربیت اور مختلف نفرت انگیز تحریکات، اور متعصّبانہ لٹریچر کی بنا پر اس میں اپنے مذہب اور

تہذیب کے احیاء اور اس کو بزور نافذ کرنے کا جارحانہ اور مطلق العنانہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے، پھر اس کو اپنی عددی اکثریت، اور جمہوریت کے عام اصول ومعمول کے مطابق اپنی خواہش اور مفاد کے مطابق قانون سازی اور اس کے بعد اس کے نفاذ کا کلی حق حاصل ہوتا ہے، تو ایسا فرقہ اور اقلیت اپنے سارے تاریخی کارناموں، اور جنگِ آزادی میں قائدانہ وسرفروشانہ حصہ لینے کے باوجود بلکہ اس تاریخی حقیقت کے باوجود کہ جنگ آزادی کے آغاز کا سہرا اس کے قائدین اور دینی پیشواؤں کے سر ہے۔[1] دینی ارتداد کے خطرہ میں مبتلا اور اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی سے محروم ہوجاتی ہے اور بعض اوقات (دل پر ہاتھ رکھ کر اور قارئین سے معذرت کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ) وہ غلامی کے دور کو، آزادی کے دور پر ترجیح دینے لگتی ہے۔

اسی حقیقت، علم وتجربہ کی بنا پر اسلامی شریعت پر آزادانہ عمل کرنے کی آزادی کے سلب ہوجانے کا خطرہ ہے، اور ایسے قوانین کے نافذ ہونے کے قوی امکانات پیدا ہوگئے ہیں، جن سے ملک کی مسلمان اقلیت ایک متبادل شریعت کے خطرہ سے دوچار ہوگئی ہے، ہندوستان کے کچھ بیدار مغز، حقیقت بیں وفرض شناس اور باتوفیق علماء واصحاب فکر نے (جن میں امیر شریعت بہار مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانیؒ پیش پیش تھے) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ایک ہندگیر تحریک شروع کی، اور ایک ایسی مجلس کی تنظیم کی جو اس خطرہ کا مقابلہ کرے، اور صرف مذہبی، بلکہ علمی وفکری تقابلی مطالعہ کی روشنی میں اس کے خطرہ سے نہ صرف مسلمان فرقہ کو بلکہ قانون ساز ایوانوں اور ملک کے دانشوروں اور وطن دوستوں کو آگاہ کرے، اسی مقصد کے حصول کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ایک تنظیم اور مجلس قائم ہوئی، جس کی صدارت ملک کے مقبول ترین عالم وداعی اور ہندوستان کے سب سے بڑے دینی وتعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند کے مہتمم اعلیٰ مولانا

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ'' اردو، انگریزی - از مقدمہ نگار

قاری محمد طیب صاحب مرحوم نے کی، اس جدوجہد اور اس تحریک کے قائدین کی شخصیت، وقار اور مسلمانوں کے اعتماد و رجوع عام کی وجہ سے شریعت اسلامی میں کھلی مداخلت کا خطرہ (خواہ عارضی طور پر) ٹل گیا، اور ملک کے قائدین کو اندازہ ہوگیا کہ مسلمان اس کو کسی حالت میں برداشت نہیں کرسکتے، اور یہ ملک کے مفاد حقیقت پسندی اور دور بینی کے خلاف ہے۔

لیکن ابھی حال میں یونیفارم سول کوڈ کے نام سے ایک نئی تحریک اور نیا خطرہ سامنے آیا، جس میں ان سطحی النظر ایوان قانون سازی کے ارکان، سیاسی قائدین، اور عام اخبار بینوں کے لئے بھی بڑی جاذبیت اور دل کشی کا سامان تھا، کہ بہرحال جدید ذہن کے لوگوں اور سطحی النظر باشندگانِ ملک کے لیے، وحدت، تنوع پر ترجیح رکھتی ہے، خواہ اس کا نتیجہ ملک کی عام زندگی، باہمی تعلقات اور ملک استحکام کے لئے صفر کا درجہ رکھتا ہو۔

اس لئے جب سے یونیفارم سول کوڈ کی تحریک شروع ہوئی، اس مسئلہ پر زیادہ گہرائی، طاقت، اور علمی استدلال، اور تحلیل وتجزیہ کی صلاحیت کے ساتھ اظہار خیال اور تبصرہ کی ضرورت تھی، یہ کام ایک ایسے ہی فاضل کے قلم سے انجام پاسکتا تھا جو ایک طرف تفسیر و حدیث پر گہری اور براہ راست نظر رکھتا ہو، وہ اس کے مطالعہ اور تدریس کا یہ موضوع ہو، فقہ پر بھی اس کی عمیق نظر ہو، دوسری طرف تقابلی مطالعہ اور مغربی ممالک کے معاشرتی حالات اور اجتماعی زندگی کے حقائق سے بے خبر نہ ہو، یہ تعریف یا (تعارف) رسالہ ہذا کے مصنف جناب مولانا محمد برہان الدین صاحب سنبھلی فاضل دارالعلوم دیوبند اور استاد تفسیر وحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء پر صادق آتا ہے، مولانا کی کتاب ''معاشرتی مسائل'' اس موضوع پر ایک مطالعہ، بلکہ حوالہ کی چیز سمجھی جانی چاہیے، اس کے متعدد ایڈیشن ''مجلس تحقیقات و نشریات اسلام'' ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوچکے ہیں، لیکن اب یونیفارم سول کوڈ کے مطالبے اور مسئلے کے سامنے آجانے کے بعد ایک نئے مستقل مقالہ کی ضرورت تھی، اس

ضرورت کو مولانا نے پیش نظر رسالہ میں جس کا عنوان ''شریعت کے ازدواجی قوانین میں عورتوں کے حقوق'' ہے،[1] پورا فرمایا، اس لیے کہ اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ کہی اور دہرائی جاتی ہے، اور جس کو عنوان بنا کر اسلام کے بارے میں تعلیم یافتہ طبقہ میں (یہاں تک کہ نیم تعلیم یافتہ یا اصل مآخذ دینی سے بے خبر) نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں احساس کمتری پیدا کیا جاتا ہے، وہ عورتوں کے حقوق کا مسئلہ ہے، مولانا نے اس کو عنوان بنا کر قرآن وحدیثِ صحیح کے حوالوں اور اسلامی فقہ کے متفقہ احکام کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں اور اس کے بارے میں جس حقیقت پسندی، انصاف اور فطرت انسانی سے واقفیت اور اس کے ساتھ عدل وانصاف کا ثبوت دیا ہے، اس کی نظیر کسی مذہب میں نہیں ملتی، اس لئے کہ یہ اس کا بنایا ہوا اور نازل کیا ہوا قانون ہے جو خود اپنے متعلق فرماتا ہے'' **اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِیفُ الْخَبِیرُ**''۔[2] (کیا وہ اس کو نہ جانے گا جس کو اس نے خود پیدا کیا ہے، اور وہ نازک اور وسیع علم رکھنے والا ہے)۔

مولانا نے آیت ''**عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ**''۔[3] (بیویوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے زندگی بسر کیا کرو) پر عمل کرنے اور نسل انسانی اور مختلف تاریخی عہدوں کے لیے اسوۂ نبوی اور معاشرہ اسلامی کے نمونے حدیث وسیرت سے پیش کئے ہیں، عورتوں کے حقوق اور مردوں کے فرائض کا ذکر کرنے کے بعد، مردوں کے حقوق اور عورتوں کے فرائض کے سلسلہ میں بھی اسلامی تعلیمات وہدایات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

ان رعایتوں اور خصوصیتوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد جن کی وجہ سے حقیقت

---

[1] اس رسالہ میں ایک مضمون اسی عنوان سے شامل ہے جس کا ذکر حضرت مولانا مدظلہ نے فرمایا، اس کے علاوہ ایک دوسرا مضمون ''یونیفارم سول کوڈ اور مسلم پرسنل لا'' (ایک جائزہ) بھی اسی میں شامل ہے۔ رسالے کے نام میں دونوں کی رعایت ہے۔ ——— برہان

[2] سورۃ الملک آیت ۱۴ [3] سورۃ النساء آیت ۱۹

پسند اور منصف مزاج، باخبر غیر مسلم مفکرین یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے، کہ اسلامی قوانین میں عورتوں کو جتنے حقوق دیئے گئے ہیں، وہ کسی بھی قانون میں نہیں دیئے گئے۔[1]

ان حقائق اور خطرات کی روشنی میں جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا یہ رسالہ جو قارئین کے پیش نظر ہے، بروقت اور برمحل اور ایک موزوں ترین اور اہل فاضل کے قلم سے قارئین کے سامنے آرہا ہے، امید ہے کہ مختلف تحریکوں کے قائدین، قانون سازایوانوں کے ارکان، اور ملک کے مفاد میں کام کرنے والے، اس سے استفادہ کریں گے، اور یہ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ ملک کے مفاد میں ہوگا۔

وماالتوفیق الاّ من عنداللّٰہ

ابوالحسن علی ندوی
صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
۲/رجب المرجب ۱۴۱۶ھ
۲۶/نومبر ۱۹۹۵ء

[1] ملاحظہ ہو خطبۂ صدارت اجلاس احمد آباد، اکتوبر ۱۹۹۵ء از راقم سطور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو جس صبر آزما صورتحال کا مسلسل سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی خطرناکی بلکہ زہرہ گدازی کے احساس سے شاید ہی کوئی باشعور مسلمان خالی ہو کہ آئے دن ہونے والے فسادات کی وجہ سے جان و مال کی تباہی، تعلیمی و اقتصادی پسماندگی، سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں سے محرومی کا شکار ہیں، مزید برآں یہ کہ مسلمان یہاں ایک ایسی جارحانہ تحریک کے حملوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جو ہندو احیاء پرستی (ہندوتو) کے جذبہ سے پورے ملک کو ''بھگوا رنگ'' میں رنگ دینے۔ بلکہ غرق کر دینے، اور مسلمانوں کا تشخص و امتیاز ختم کرنے کے لیے چلائی جارہی ہے، جس کی 'لَے' کبھی تیز ہو جاتی ہے اور کبھی دھیمی، (بلکہ مصلحۃً سوچی سمجھی اسکیم کے تحت یہ زیر و بم کیا جاتا ہے) رواں صدی کے ساتویں دہے میں نہایت زور و شور کے ساتھ جب یہ تحریک چلائی واٹھائی گئی تو اس وقت ملت اسلامیہ کے بیدار مغز اور صاحب بصیرت افراد، جن میں علماء سرفہرست تھے، نے ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی تشکیل کی، جس کے قیام و مساعی سے، کسی نہ کسی حد تک، زور و شور میں کچھ کمی آئی، اگر چہ وہ عارضی ثابت ہوئی، مگر اب ادھر کچھ عرصہ سے پھر ملکی سیاست میں کھلی جارحیت پسند بعض ہندو جماعتوں کے طاقتور بن جانے کی بنا پر، بے شمار خطرات، امکانات اور اندیشوں کے دائرہ سے نکل کر واقعات کی شکل میں مسلمانوں کو درپیش ہیں، جن کے احساس سے ہر ہوش مند بجا طور پر فکرمند بلکہ بے چین ہے، مثلاً یہ

کہ اب نہ صرف شریعت اسلامی پر مشتمل عائلی قوانین (مسلم پرسنل لا) پر کھلم کھلا، زبانی و تحریری، حملے شروع کر دیئے گئے ہیں (جس میں ''زرد صحافت'' بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے) بلکہ پرسنل لا میں ترمیم کر کے اسے ختم کر دینے کے عملی اقدامات ہونے لگے ہیں، (مہاراشٹرا اسمبلی میں ۱۹۹۵ء کے اندر پاس کئے گئے چند بل، اس کا نمونہ ہیں) مزید ستم یہ کہ اس خوئے بد، کے لئے ایک بہانہ یہ بنایا گیا کہ ''مسلم پرسنل لا'' میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے اور انھیں پورے حقوق نہیں دیئے گئے ہیں'' اور اس جھوٹ کو اتنی بار اور اس بلند آہنگی سے دہرایا گیا کہ غیر تو غیر، بعض ''اپنے'' بھی اسے سچ باور کرنے لگے۔ اس بہانہ کی حقیقت، بلکہ بے حقیقت سامنے لانے، یا بالفاظ دیگر اس جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کے لئے، ربع صدی کے اندر کتنے مضامین، کتنی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئیں اور کیا کیا مناسب طریقے اختیار کئے گئے، ان کا صحیح علم اللہ علیم وخبیر کے سوا کسی کو نہیں، ان مساعی کے بہتر نتائج بھی، بحمد للہ، سامنے آئے کہ بہت سوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں، (جو واقعی غلط فہمی کا شکار تھے، معاند نہ تھے) مگر اب پھر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک ایسی تحریر منظر عام پر آئے جو موجودہ صورت حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ نہایت مختصر بھی ہو کہ جسے پڑھ کر غلط فہمیاں دور ہوں اور منصف مزاج لوگوں کے ذہنی اطمینان کا ذریعہ بن سکے اور جس میں آج کے زیر بحث چند مسائل یونیفارم سول کوڈ، مسلم پرسنل لا اور عورت کے حقوق پر گفتگو کی گئی ہو، کیونکہ زمانہ کی تیز رفتاری نے طویل تحریر پڑھنے کی فرصت لوگوں کے پاس نہیں چھوڑی ہے۔ اس ضرورت کو کسی نہ کسی درجہ میں پورا کرنے کی غرض سے راقم نے اپنا ٹوٹا پھوٹا قلم سنبھالا اور بتوفیق خداوندی، دو مقالے لکھے (جو تعمیر حیات وغیرہ [1] میں شائع بھی ہوئے) اب ان مقالوں کو، ترمیم واضافوں کے بعد رسالہ کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے، خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مقبولیت عطا کرے اور قبول

[1] ایک مقالہ ''قومی آواز'' لکھنؤ میں بھی شائع ہوا۔

فرمائے نیز مقصد کے حصول۔ مسلم پرسنل لا کی حفاظت۔ میں معاون بنائے (**وما ذالک علی اللّٰہ بعزیز**)

آخر میں مخدومنا المعظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی دمت برکاتہم کا شکریہ ادا کرنا بھی احقر ضروری سمجھتا ہے کہ موصوف نے اپنے غیر معمولی مشاغل کے باوجود، اس حقیر کے مقالے ملاحظہ فرمائے اور انھیں رسالہ کا پیکر عطا کرنے کا سامان، نیز بیش قیمت اور معلومات افزا مقدمہ مزین کر کے ممنون فرمایا۔ (**فجزاہ اللّٰہ احسن الجزاء**)

والسلام

احقر

محمد برہان الدین سنبھلی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۱/رجب ۱۴۱۶ھ

۱۵/دسمبر ۱۹۹۵ء جمعہ

یونیفارم سول کوڈ اور مسلم پرسنل لا

-: ایک جائزہ :-

ملکی قانون سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی یہ جانتے ہیں کہ ملک میں رائج قوانین کی دو اہم قسمیں، سول کوڈ (CIVIL CODE) اور کریمنل کوڈ (CRIMINAL CODE) کہلاتی ہیں جس کے لیے اردو زبان میں بالترتیب ضابطۂ ''دیوانی'' اور ''فوجداری'' کی اصطلاحیں استعمال ہوتی رہی ہیں۔

دوسری قسم (CRIMINAL CODE) ضابطۂ فوجداری کے اندر جرائم کی سزائیں اور بعض انتظامی امور سے متعلق قوانین آتے ہیں، مثلاً کسی جرم پر کیا سزا دی جائے گی؟ اور مجرم کی ضمانت کے لیے کیا اصول وضوابط ہوں گے اور انتظامی طور پر کس قسم کے اقدامات حکومت کرے گی؟

ظاہر ہے اس قسم (CRIMINAL CODE) کے قوانین تمام اہل ملک کے لیے یکساں ہیں اس میں کسی نوعیت کی تفریق نسل و مذہب وغیرہ کی بنیاد پر ازروئے دستور نہیں کی گئی ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس قسم کے لحاظ سے سارے اہل ملک یکساں (UNIFORM) ہیں یعنی UNIFORM CRIMINAL DODE کی زنجیروں میں سارے اہل ملک بندھے ہوئے ہیں۔

یونیفارم سول کوڈ کیا ہے؟

پہلی قسم سِول کوڈ (CIVIL CODE) کے دائرہ میں وہ تمام قوانین آتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی، تمدنی جیسے امور سے ہے، اس قسم کے بیشتر قوانین بھی تمام اہلِ ملک کے لئے یکساں ہیں، مثلاً خرید وفروخت، معاملات، قرض کے لین دین وغیرہ جیسے امور سے متعلق مقدمات کے فیصلے سرکاری عدالتوں میں بلا لحاظ مذہب ونسل تمام اہل ملک کے لیے یکساں طور پر ہوتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ مسلمان پر سود کی ڈگری نہ ہو (حالانکہ مسلمان کے لئے ازروئے شریعت سودی لین دین ممنوع ہے) اور غیر مسلم پر ہو، بلکہ دونوں کے خلاف یا موافق ڈگری ہوگی بشرطیکہ اس طرح کا مقدمہ حکومتی عدالت میں جائے، اسی قانون کی ستم رانی سے مسلمان اپنی بڑی بڑی جائدادوں اور قیمتی زیورات سے محروم ہوگئے جس کے نتیجہ میں بڑے بڑے دولت مند کنگال ونادار بن گئے۔

مسلم پرسنل لا کسے کہتے ہیں؟

البتہ اس قسم CIVIL CODE کے ایک حصہ میں (جسے ''پرسنل لا'' (PERSONAL LAW) کہا جاتا ہے، اس میں) ملک کی بعض اقلیتوں کو ان کے مذہب کے لحاظ سے کچھ خصوصی شعبوں میں الگ قوانین پر عمل کرنے کا اختیار دے دیا ہے، ایک ماہر قانون کی رائے کے مطابق عموماً اب اسے ہی ''سول کوڈ'' کہا جانے لگا ہے۔

اسی کو ''پرسنل لا'' کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے، اسی کے تحت مسلمانوں کو بھی دستور ہند میں آزادی دی گئی ہے، یعنی مسلمانوں کو ملک کے دستور میں یہ حق دیا گیا ہے کہ نکاح، طلاق، ایلاء، ظہار، لعان، خلع، مباراۃ (خلع ہی کی ایک شکل) فسخِ نکاح، عدت، نفقہ، وراثت، وصیت، ہبہ، ولایت، رضاعت، حضانت، وقف (خیراتی اور غیر خیراتی دونوں)

سے متعلق مقدمات اگر سرکاری عدالتوں میں لے جائے جائیں اور دونوں فریق مسلمان ہوں تو سرکاری عدالتیں اسلامی شریعت کے مطابق ہی مذکورہ معاملات میں فیصلے کریں گی، ''ان قوانین کا مجموعہ ''پرسنل لا'' کہلاتا ہے، اگرچہ ''پرسنل لا'' کی تعبیر اسلامی نقطۂ نظر سے محل نظر ہے کیوں کہ یہ عیسائی نقطۂ نظر کی عکاس ہے، عیسائیوں کے یہاں یہ اصول مسلم و مشہور ہے کہ ''خدا کا حق خدا کو دو اور قیصر کا قیصر کو'' یعنی ملکی قوانین کی پابندی کرنے پر قانوناً مجبور ہیں، مگر خدائی قوانین (جو ان کے یہاں زیادہ تر عبادات کے قبیل کے ہیں) انسان کا ذاتی ونجی معاملہ ہے، اس پر عمل کرنے کے لئے کوئی سرکار مجبور نہیں کرسکتی، اسی قسم کے قوانین کے لئے ''پرسنل لا'' یعنی ذاتی ونجی قوانین کی اصطلاح ایجاد کی گئی۔

اس کے برخلاف اسلامی نقطۂ نظر سے یہ تقسیم صحیح نہیں، کیونکہ اسلامی حکومت مسلمانوں کو دونوں قسم کے قوانین پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کرسکتی ہے، چنانچہ جس طرح جرائم کی سزائیں مجرموں کو بھگتنے پر مجبور کرسکتی ہے اسی طرح وہ نماز پڑھنے پر بھی جبر کرسکتی ہے اور نماز کے تارک کو بھی اسی طرح سزا دینے کی مجاز ہے جس طرح چور کو سزا دینے کی، لیکن اب چونکہ یہی اصطلاح معروف و رائج ہے، اس لئے مسلمانوں نے بھی اسے اختیار کرلیا ہے، حالانکہ اس مجموعۂ قوانین کے لئے مناسب اصطلاح ''عائلی قانون'' (FAMILY LAW) معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس میں زیادہ تر اسی زمرہ کے قوانین ہیں۔

یکساں سول کوڈ کا مطلب

مذکورہ جائزہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ رہا ہوگا کہ ملک کے اندر جاری ہزاروں قوانین میں سے صرف چند میں ہی (جن کا ذکر اوپر آیا) مسلمانوں کو اپنی شریعت پر عمل کرنے کا قانونی ودستوری حق دیا گیا ہے، حالانکہ اسلامی شریعت زندگی کے ہر گوشے پر محیط

ہے اور ہر شعبہ کے لئے اس میں تفصیلی قوانین موجود ہیں مگر ان پر مسلمانوں کو عمل کرنے کا یہ قانونی حق نہیں ہے، اس کتر بیونت اور کیسی کتر بیونت کہ غالباً ہزارواں حصہ ہی باقی بچ سکا ہے۔ کے بعد بھی ہر طرف سے یہ شور مچایا جارہا ہے کہ اسے بھی ختم کیا جائے اور اس کے بچے کھچے حصے میں بھی مسلمان اپنی شریعت کے قوانین جو دراصل خدا کے دیئے ہوئے ہیں، یعنی براہ راست قرآن مجید اور احادیث نبویہؐ میں بیان ہوئے ہیں (اس کی کچھ تفصیل ''شریعت کے ازدواجی قانون میں عورتوں کی رعایت'' والے حصے میں ملاحظہ کی جائے) پر عمل کرنے کے بجائے ملک کے غیر مسلم (ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے اور ''سلطانی جمہور'' کے زمانہ میں اکثریت ہی فیصلہ کن ہوتی ہے) جس طرح کے قوانین بنائیں مسلمان بھی اس پر بلاچوں چرا عمل پیرا ہوجائے؟

اگرچہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ تمام اہلِ ملک کے ''پرسنل لا'' ختم کرکے سب پر یکساں قوانین نافذ کئے جائیں، یعنی یکساں سول کوڈ UNIFORM CIVIL CODE عائد و لازم کردیا جائے لیکن درحقیقت مسلمانوں کا دستوری حق چھین لینا ہی مقصدِ اصلی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ یہ حق غیر ملکی حکومت (انگریزی اقتدار) کے زمانہ میں بھی مسلمانوں کو دستور میں دیا گیا تھا، چونکہ جنگِ آزادی میں مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا اور مسلم مجاہدین کو برادران وطن (جنگ آزادی کے شرکاء) نے یہ اطمینان دلایا تھا کہ آزادی کے بعد بھی یہ حق برقرار رہے گا اس لیے دستور ہند میں ''مسلم پرسنل لا'' کی آزادی کا حق مسلمانوں کو دیا جانا مسلمانوں پر کوئی احسان نہیں بلکہ پچھلے حق کا بقاء اور جنگ آزادی کے وقت کیے ہوئے وعدہ کا ایفاء ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے اولین معماروں کو شرم آئی کہ غیر ملکی حکومت کے زمانہ میں مسلمان اہل وطن کو جو حق حاصل تھا اسے ''اپنی'' حکومت کے اندر چھین لیا جائے، چنانچہ جب تک یہ اولین معمار موجود رہے ''یکساں سول کوڈ'' نافذ کرنے کی آواز دبی رہی یا دھیمی رہی مگر جیسے ہی وہ لوگ دنیا سے رخصت ہوئے یہ ''لے'' تیز

تر ہونے لگی تا کہ آنکہ اس صدی کی ساتویں دھائی میں مہاراشٹر کی اسمبلی میں اس مقصد سے ایک بل پیش کر دیا گیا جس سے یہ خطرہ بالکل سامنے آ گیا (آج پھر مہاراشٹر ہی میں یہ خطرہ دوبارہ شدید تر شکل میں سامنے آیا ہے کہ وہاں اس قسم کے کئی بل ۱۹۹۵ء میں پاس بھی کر دیئے گئے ہیں) کہ ''مسلم پرسنل لا'' کے نام سے باقی اسلامی قوانین کے بچے کھچے حصے کو بھی ختم کر کے رکھ دیا جائے گا اور تمام مسلمانوں کو جمہوری یا بالفاظ صحیح اکثریت کے بنائے ہوئے قوانین کے سیلاب میں بہتے رہنے پر مجبور کر دیا جائے گا، تا آنکہ ان انفرادیت کے ساتھ احساسِ زیاں بھی مٹ جائے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کا پس منظر

اس صورت حال سے ملت کے بہی خواہ بجا طور پر فکر مند ہوئے ان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور) اور مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیش پیش تھے، چنانچہ ان حضرات کی مساعی سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کی زیر صدارت مسلم پرسنل لا کنونشن بمبئی میں ۱۹۷۲ء میں ہوا، بمبئی کا انتخاب راقم کی تجویز پر اس لئے ہوا کہ وہاں ''یکساں سول کوڈ'' بل پہلی بار اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا۔

پھر ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' (۱۹۷۳ء میں) وجود میں آیا، مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے کے لئے اس کے خلاف پروپیگنڈے کی زبردست مہم بھی چلائی گئی اور برابر چلائی جا رہی ہے، اسے ظالمانہ، غیر مہذب، رجعت پسندانہ اور عورتوں کے حقوق کو پامال کرنے والا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر سادہ ذہنوں کو مسموم کیا جا رہا ہے، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی الزام درست نہیں ہے۔

اسلامی قوانین میں عورتوں کو سب سے زیادہ حقوق دیئے گئے (غیر مسلموں کا اعتراف)

عورتوں کے حقوق کی رعایت کا جہاں تک تعلق ہے اس کے بارے میں بہت سے منصف مزاج واقف کار غیر مسلموں نے بھی برملا اعتراف کیا ہے کہ اتنے حقوق کسی قانون میں عورتوں کو نہیں دیئے گئے جتنے اسلامی شریعت نے اسے دیئے ہیں، اس بات کی تازہ شہادت سابق وزیر اعظم ہند آنجہانی راجیو گاندھی کا وہ اعتراف ہے جو انہوں نے (سپریم کورٹ کے شاہ بانو کیس میں نفقۂ مطلقہ سے متعلق فیصلہ کے خلاف مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے بورڈ کے صدر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی سرپرستی میں چلائی گئی مہم کے دوران) مسلم علماء کے ذریعہ قانونِ شریعت پر مطلع ہونے کے بعد جنوری ۱۹۸۶ء میں اپنے ایک اخباری انٹرویو کے اندر یہ کہتے ہوئے کیا ''اسلامی قوانین ہمارے قانون سے بڑھ کر عورتوں کے حقوق و مفادات کے ضامن ہیں''۔[1] ان کے علاوہ دیگر باخبر غیر مسلموں کی شہادت و اعتراف کے لیے دیکھئے خطبۂ صدارت اجلاس احمد آباد ۱۹۹۵ء از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ قریب قریب اسی طرح کا عملی اعتراف ان کی والدہ اندرا گاندھی نے اپنے زمانۂ وزارت عظمیٰ میں (۱۹۷۳ء یا ۱۹۷۴ء کے اندر) سی، آر، پی، سی کی دفعہ ۱۲۷ میں پارلیمنٹ کے ذریعہ ترمیم کروا کر کیا تھا، جب انھیں مسلم علماء کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مسلمان کی بیوی کو شوہر کی طرف سے تمام ضروری اخراجات (کھانا، کپڑا، رہائش وغیرہ) کے علاوہ مہر کے نام سے بھی ایک رقم کا حق حاصل ہوتا ہے، جو عموماً بڑی اور خطیر رقم ہوتی ہے، تو وہ یہ جان کر نہ صرف حیران بلکہ اتنا متاثر ہوئیں کہ انہوں نے مسلمان مطلقہ عورت کو تا حیات (یا تا نکاح ثانی) نفقہ دلانے والی دفعہ کو مسلمان عورتوں کے حق میں مذکورہ ترمیم سے محدود کروا دیا۔[2]

---

[1] کاروانِ زندگی، ج ۳ ص ۱۴۰ (از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)۔

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سہ روزہ اخبار ''دعوت'' دہلی کا مسلم پرسنل لا نمبر۔

لیکن اس ترمیم کی افادیت کو مختلف ہائیکورٹوں کے ججوں نے اپنی تشریحات کے ذریعہ کم بلکہ ختم کردیا اور رہی سہی کسر سپریم کورٹ کے شاہ بانو کیس کے فیصلہ نے (۱۹۸۵ء میں) پوری کردی، جس کا تدارک کرانے میں مسلم پرسنل لا بورڈ کو بہت محنت کرنی پڑی، اس کے بعد پارلیمنٹ سے نیا قانون پاس ہوا اس سے بھی بس جزوی ہی تلافی ہوسکی، مگر اسے بھی کئی ہائی کورٹوں کے متعدد ججوں نے اپنے فیصلوں سے بے اثر بنادیا۔

مسلم پرسنل لا کے یوں تو بہت سے اجزاء پر اعتراف کئے جاتے ہیں، اور انہیں ظالمانہ اور حقوق نسواں کو پامال کرنے والا بتایا جاتا ہے، لیکن ان میں طلاق، تعدد ازدواج اور وراثت کے قوانین کو بطور خاص نشانہ بنایا جاتا ہے، حالانکہ جو حقیقت پسند، منصف مزاج ان کا گہرائی سے مطالعہ کرے گا وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ ان سے زیادہ متوازن منصفانہ کوئی قانون نہیں اور فطرت انسانی کی اتنی رعایت کسی بھی دوسرے قانون میں نہیں ملتی لیکن ناقص مطالعہ یا تعصب کی عینک سے وہ ایسے نظر نہ آئیں تو حیرت کی بات نہیں!

غیر جانبدارانہ مگر حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر رکھنے والے لوگوں کے سامنے مسلم پرسنل لا کے اسی حساس حصے کی صحیح تصویر کشی اور عکاسی اسلامی اصول، قرآن وسنت وغیرہ کی روشنی میں پیش کرنے کی سعادت راقم بیس سال قبل حاصل کرچکا ہے۔[1] اس بارے میں یہاں بہت مختصر طور پر کچھ باتیں عرض کی جارہی ہیں (تفصیل کے طالب راقم کی کتاب ''معاشرتی مسائل'' ملاحظہ فرمائیں)

وراثت

اسلامی قانون وراثت کی یہ شق سب سے زیادہ کھٹکتی اور تنقید کا نشانہ بنائی جاتی ہے

[1] ''معاشرتی مسائل'' مطبوعہ بار اول ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۹۷۵ء از مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، اس کے متعدد ایڈیشن مختلف مقامات سے شائع ہوئے۔

کہ عورتوں کو مرد کے مقابلہ میں آدھا حصہ دیا جاتا ہے، حالانکہ اس بات میں صداقت جزوی ہی ہے، کیونکہ بعض شکلوں میں (مثلاً اخیافی بھائی، بہن وارث ہوں تو) دونوں برابر کا حصہ پاتے ہیں، لیکن اکثر شکلوں میں عورت کو مرد سے آدھا ہی حصہ ملتا ہے، مگر کسی بھی قانون کے صرف ایک پہلو کو سامنے رکھنے سے اس کے درست یا نادرست ہونے کا فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہوتا بلکہ جب تک تمام پہلو سامنے نہ ہوں اس وقت تک صحیح نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا اس قانون کے ساتھ اسلامی شریعت کے دوسرے قوانین بھی سامنے رہیں تو اعتراض کی گنجائش ختم ہوجائے، مثلاً یہ کہ عورت پر ازروئے قانون شریعت اکثر حالات میں کوئی خرچ حتی کہ اس کا اپنا خرچ بھی لازم نہیں ہوتا کیونکہ شادی سے پہلے والد یا بھائی (یا دوسرے اولیاء) پر، شادی کے بعد شوہر پر، شوہر سے علیٰحدگی کے بعد بھی (اگر وہ طلاق کے ذریعہ ہوئی ہے) تو کچھ عرصہ (عدت کے دوران) شوہر پر ہی رہتا ہے، اور ''متاع طلاق'' کے نام سے مزید کچھ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اگر طلاق دینے والے شوہر سے مطلقہ عورت کے بچے ہیں تو جب تک بچے دودھ پینے یا پرورش ونگرانی کے لیے ماں کے محتاج رہیں گے اس وقت تک نہ صرف ان بچوں کا بلکہ انہیں دودھ پلانے (اور ان کی نگرانی کی غرض سے پابند رہنے) والی اس مطلقہ کا پورا خرچ بھی اس پر رہے گا۔ یہیں سے اس پروپیگنڈے کی بھی تردید نکل آتی ہے کہ ''مطلقہ عورت بچوں کو لیے ماری ماری پھرتی ہے'' ہاں قانون شرعی سے ناواقفیت یا بے عملی کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہوجائے تو اس میں قانون شریعت کو الزام دینا زیادتی ہوگی، پرورش و نگرانی کی مدت لڑکوں کے لیے تقریباً سات سال اور لڑکیوں کے لئے ان کے بالغ ہونے تک ہے، مزید یہ کہ نکاح سے عورت مہر کی حقدار بھی ہوتی ہے جو بالعموم ایک بڑی رقم ہوتی ہے۔ مرد پر نکاح کے بعد دوہری تہری مالی ذمہ داریاں عائد ہوجاتی ہیں اور قانون شریعت کی رو سے اسے کچھ ملنا بھی شادی کے وقت ضروری نہیں۔

صورت حال کو سمجھنے کے لیے یہ مثال شاید مفید ہو کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا، اس

نے ایک لڑکا ایک لڑکی وارث اور تیس ہزار روپئے کا ترکہ چھوڑا، اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق لڑکے کو بیس ہزار اور لڑکی کو دس ہزار روپئے ملے، اب فرض کیجئے کہ ان دونوں نے شادیاں کیں اور ہر ایک کا مہر دس دس ہزار روپئے مقرر ہوا۔ اس صورت میں لڑکے کے پاس بیوی کو مہر دینے کے بعد دس ہزار رہ گئے اور لڑکی کے پاس شوہر سے مہر پانے کے بعد بیس ہزار ہو گئے، مزید برآں یہ کہ لڑکی پر کوئی خرچ نہیں کہ جس میں وہ یہ روپئے صرف کرے، اس کے برخلاف لڑکے پر اس کا اپنا ذاتی خرچ اور اپنی بیوی کے تمام اخراجات اور پھر بچے ہونے کے بعد ان کے تمام اخراجات لازم ہوں گے، نتیجۃً وہ باقی ماندہ دس ہزار بھی بہت جلد ختم ہو جانے کا امکان ہے، جبکہ لڑکی کے پاس ترکہ سے دوگنی رقم ہوگئی۔ اور بظاہر آئندہ بھی وہ اس کے پاس ہی رکھی رہے گی (مذکورہ بالا شکلوں کے علاوہ بھی دوسری صورتوں میں) نادار عورت کے اخراجات کسی نہ کسی قریبی عزیز کے ذمہ ہوتے ہیں اگر عزیز نہ ہو تو پھر تمام مسلمان پر۔[1]

اس جائزہ کے بعد کون منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ شریعت کے قانونِ وراثت میں عورت کی حق تلفی کی گئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کسی جزو کو کل سے علیٰحدہ کر کے دیکھا جائے گا اسی طرح کی غلط اور بدنما شکل سامنے آئے گی، جس طرح کی صرف ترکہ کی یہ شق دیکھ کر کہ عورت کو مرد سے آدھا حصہ ملتا ہے، دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دینے سے آجاتی ہے، واضح رہے کہ لڑکے کے ساتھ لڑکی کو بھی وراثت کا حق صرف اسلام نے ہی دیا ہے، کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔

قانونِ طلاق

مذکورہ بالا تفصیل سے اسلام کے قانونِ طلاق میں مرد کو ہی طلاق کا اختیار دینے کی حکمت بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ طلاق کے نتیجہ میں سراسر مالی نقصان مرد ہی کا ہوتا ہے،

[1] تفصیل ملاحظہ ہو اسی کتاب کے عنوان ''شریعت کے ازدواجی قانون میں عورت کے حقوق'' کے تحت۔ ص ۲۷

عورت کے لئے تو بہت سی شکلیں مالی مدد کی نکل آتی ہیں، دریں صورت عورت کو طلاق کا حق دینے میں بڑے فتنے پیدا ہوں گے، کیونکہ وہ بسا اوقات اپنی مالی منفعت کی خاطر شوہر کو طلاق دے کر دوسرے شخص سے شادی کرنے اور پھر اس سے مالی فائدہ اٹھا کر اسے بھی طلاق دینے اور مزید اسی طرح کرتے رہنے کو پیشہ بنا سکتی ہے، اس سے خاندانی نظام- جو اس رشتہ کا اصل مقصد ہے۔ میں جو تباہی آئے گی اس کا اندازہ کر کے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اب یہ کوئی فرضی بات نہیں رہ گئی ہے بلکہ یورپ وغیرہ میں اس تباہی کا تماشا آئے دن ہوتا رہتا ہے ع

دیکھے مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پھر صحیح اسلامی معاشرہ میں تو عورت کا خواہ مطلقہ ہو یا بیوہ، نکاح ثانی بھی بآسانی ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوقات اسے عدت کے دن پورے کرنے مشکل ہو جاتے ہیں کہ دوسرے نکاح کے خواہش مند پیدا ہو جاتے ہیں (غالباً اسی وجہ سے قرآن مجید میں عورت کو عدت کے درمیان پیغام صاف طور پر دینے سے منع کیا گیا ہے) اور پھر اگر عورت کو اپنے شوہر سے واقعی جائز شکایات ہوں اور ان کے ازالہ کی کوئی سبیل نہ نکل رہی ہو تو اسے خلع اور فسخ نکاح جیسے مواقع اسلامی قانون میں دیئے گئے ہیں جن کے ذریعہ وہ ظالم شوہر سے گلوخلاصی کرا سکتی ہے، پھر شوہر کو طلاق کا حق بھی ایسا آزادانہ نہیں دیا گیا ہے جیسا کہ عام طور سے ذہنوں میں غلط تخلیل پیدا ہو گیا ہے (اس تخیل میں مسلمان مردوں کے بے جا حق طلاق استعمال کرنے کا بھی بڑا دخل ہے) بلکہ طلاق دینے سے پہلے اور بھی کئی مراحل سے گذرنے کا حکم دیا گیا ہے، آخری چارۂ کار کے طور پر طلاق دینے کی اجازت دی گئی ہے جبکہ دونوں میں نباہ کی شکل ہی نظر نہ آتی ہو اور ان دونوں کا زبردستی نکاح کے بندھن میں بندھے رہنا دونوں بلکہ دونوں کے خاندانوں کے لئے وبال جان بن رہا ہو۔ پھر اس میں ایسی سختی بھی نہیں برتی گئی کہ عدالت کے واسطہ کے بغیر طلاق واقع ہی نہ کی جا سکتی ہو بلکہ ایسی ناخوشگوار

صورتِ حال سے نکلنا اور چھٹکارا پانا بھی آسان بنا دیا گیا ہے کیوں کہ عدالت میں مقدمات کے چکر میں پڑ کر بسا اوقات طلاق دینا اور لینا اتنا خرچیلا اور پریشان کن عمل ہوتا ہے کہ انسان اس سے بچنے کے لئے بعض اوقات، ناکردنی کر بیٹھتا ہے، جن مذاہب یا ملکوں میں طلاق صرف بذریعہ عدالت ہی دینے لینے پر پابندی ہے وہاں عورتوں کو جلانے، دریابرد کردینے اور دوسرے طریقوں سے ہلاک کردینے کے بکثرت واقعات پیش آنا۔ اس پابندی کے خلافِ فطرت ہونے کے واضح دلائل ہیں۔ پھر عدالت کے ذریعہ طلاق دینے میں عموماً عورت کے کیریکٹر میں خرابی ثابت کرنا سہل طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سچ کم، زیادہ تر جھوٹے الزامات اس صنفِ نازک پر لگائے جاتے اور اس کے ثبوت پیش کیے جاتے ہیں، غور کیا جائے کہ ایسی صورت میں کیا عورت کی بدنامی نہ ہوگی؟ اور کیا ایسی طلاق کے بعد اس سے کوئی دوسرا شریف آدمی نکاح کرنے پر راضی ہو سکے گا؟

سبق آموز

دنیا کے مشہور مذاہب بشمول ہندو مذہب میں طلاق کا قانون ہی نہیں ہے (کیونکہ یہ رشتہ پوری عمر کے لیے ہوتا ہے) بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک کے مرجانے کے بعد بھی دوسرے کے حق میں (بالخصوص بیوی کے) کے حق میں باقی رہتا ہے کہ وہ شوہر کی موت کے بعد بھی دوسرے سے نکاح نہیں کرسکتی (یہی وجہ ہے کہ ہندو عورتیں ستی ہو جایا کرتی تھیں، کیونکہ بیوگی کی زندگی، موت سے بدتر ہوجاتی تھی) لیکن یہ ایسی خلافِ فطرت صورت حال تھی جسے بدلنا ناگزیر سمجھا گیا، چنانچہ اب تقریباً تمام قابلِ ذکر مذاہب کے لوگوں نے کسی نہ کسی شکل میں علیٰحدگی کے بعد خواہ موت سے ہوئی ہو یا کسی اور طریقہ سے۔ دوسرا نکاح کرنے کا قانونی حق دے دیا ہے۔ اور صرف موت کی وجہ سے بلکہ بعض اور وجوہ سے بھی علیٰحدگی کا حق تسلیم کرلیا گیا ہے، مگر وہ عدالت کے ذریعہ ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، اس

میں سب سے زیادہ قابل عبرت یہ بات ہے کہ ہندو کوڈ بل مجریہ ۱۹۵۴ء میں، پہلے شوہر سے تعلق ختم ہوجانے کے بعد دوسرا نکاح کرنے کے لیے ایک سال کا وقفہ (گویا عدت) رکھا گیا تھا مگر پھر اسے بہت زیادہ طویل اور ناقابل برداشت سمجھ کر اس قانون کو اندر مئی ۱۹۷۶ء میں ترمیم کرکے یہ مدت چھ مہینے کردی گئی۔[1] اس ترمیم سے پہلے ایک ہندو مرکزی وزیر کا بیان اخبارات میں آچکا تھا کہ یہ مدت تین مہینہ ہونی چاہئے، گویا تقریباً وہی مدت جو اسلامی قانون کے اندر غیر حاملہ مطلقہ کے لئے مقرر کی گئی ہے، کیا اس کے بعد بھی اسلامی قانونِ طلاق وعدت کے بارے میں کسی نکتہ چینی کی گنجائش کسی منصف کے لیے رہ جاتی ہے!

تعدد ازدواج

مسلم پرسنل لا کے جن اجزاء کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اب بھی بنایا جارہا ہے ان میں تعدد ازدواج کے جواز کا (چند بیویاں رکھنے کے جواز کا) مسئلہ بھی ہے، حالانکہ زبانِ قال سے تو اگرچہ مانا نہیں جارہا ہے بلکہ سخت تنقید کی جارہی ہے لیکن زبانِ حال سے (یا یوں کہہ لیجئے کہ عملاً تو) سب نے اس کی افادیت تسلیم کرلی ہے بلکہ اس کا فطری ضرورت ہونا مان لیا ہے۔ ثبوت کے لئے وہ اعداد وشمار کافی ہیں جو دنیا بھر کے لوگوں کا جائزہ لے کر آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، یورپ وامریکہ کا تو ذکر چھوڑیئے۔ یہاں ہندوستان میں جو مذہبی ملک کہلاتا ہے اور جہاں مذہبی احکام پر عمل کرنے والوں کا تناسب دوسرے بہت سے ملکوں سے زیادہ ہے، وہاں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے جائزہ کے مطابق غیر مسلم قبائل میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والوں کا تناسب ۱۵،۲۵ رفیصد، بودھوں میں ۷،۹۷ رفیصد، جینیوں میں ۶،۷۲ رفیصد، ہندوؤں میں ۵،۸ رفیصد تھا، جبکہ مسلمانوں میں صرف ۷،۵ رفیصد۔ یعنی سب سے کم تھا۔[2] اور اس کے بعد ۱۹۸۱ء کے سروے کے مطابق

---

[1] ''قومی آواز'' مؤرخہ ۱۳ رمئی ۱۹۷۶ء
[2] ''قومی آواز'' لکھنؤ ۱۱ ردسمبر ۱۹۹۱ء

بھی مسلمانوں میں بیک وقت ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کا اوسط صرف ۴،۳؍فیصد اور ہندوؤں میں ۵،۶؍فیصد تھا۔[1] سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہ تامل ناڈو کے مشہور سابق وزیراعلیٰ رام چندرن (وہاں کی موجودہ وزیراعلیٰ جے للیتا، ان ہی کی صحبت یافتہ ہیں) کے کئی بیویاں تھیں جن میں دو سگی بہنیں تھیں۔[2]

علاوہ ازیں یہ کہ دنیا کے بیشتر مذاہب و ممالک بشمول ہندو مذہب میں چند بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، ہندو مذہب کی معتبر کتابوں میں تو نہ صرف مردوں بلکہ شادی شدہ عورتوں کو بھی اصلی شوہر کی موجودگی میں کئی دوسرے مردوں سے شادی (نیوگ) کا حق دیا گیا ہے (دیکھئے ''رگ وید'' بحوالہ ''معاشرتی مسائل'' ص ۷۷) بلکہ بعض مذاہب میں تو اس کی کوئی حد ہی مقرر نہیں کی گئی ہے۔ چینی مذہب، بیکی میں ایک سو بیس بیویاں تک رکھنے کی اجازت تھی۔[3]

اسلام نے تو اس کی حد بندی کر کے معتدل بنا دیا ہے۔ مجبوراً یہ بھی کہنا پڑ رہا ہے کہ جن ملکوں یا قوموں (مثلاً یورپ، امریکہ) نے چند بیویاں رکھنے کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کیا ہے کہ اس کے ذکر سے بھی مغرب زدہ لوگ شرمانے لگتے ہیں لیکن انہوں نے جنسی بے راہ روی کو ایسا عام کیا ہے کہ جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، کہ وہاں کنواری ماؤں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور ناجائز اولاد کی کثرت اس درجہ ہوگئی ہے کہ بیان کرتے ہوئے انسانیت شرما جائے۔ دل پر پتھر رکھ کر قارئین یہ اعداد و شمار ملاحظہ کرلیں، آئس لینڈ میں ۵۶؍فیصد اور سوئیڈن وڈنمارک میں ۵۰؍فیصد اولاد ناجائز ہوتی ہے۔[4]

بہرحال اس سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات مرد کے لیے ایک سے زیادہ عورت کی طلب ایک فطری تقاضا ہے جسے اگر قانونی اور مہذب طریقہ پر پورا کرنے کے

---

[1] ''نئی دنیا'' ہفت روزہ نئی دہلی، ۱۱-۱۷؍فروری ۱۹۸۶ء
[2] ''سالار'' دسمبر ۱۹۸۵ء بنگلور
[3] ''المرأۃ'' ص ۱۷۔ از ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی۔
[4] ''قومی آواز'' لکھنؤ ۱۸؍جون ۱۹۹۲ء

مواقع نہیں فراہم کیے جائیں گے تو ایسا مرد یا تو بے راہ روی کا شکار ہوگا، یا پھر ایسے مذہب یا قانون کا سہارا لے گا جس میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی گنجائش ہو۔ اسلام جو دین فطرت ہے، نے جہاں مرد کی اس فطری ضرورت کی رعایت رکھی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت دی ہے۔ (ضروری یا واجب نہیں قرار دیا، جیسا کہ غیروں کی طرف سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے) وہیں سخت پابندیاں بھی مرد پر عائد کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ تمام بیویوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے، اور وہ تمام ذمہ داریاں قبول کرے جو نکاح کے نتیجہ میں شرعی طور پر عائد ہوتی ہیں مثلاً نئی بیوی اور پہلی بیوی کے تمام واجب حقوق ادا کرے، پھر یہ کہ سب بیویاں اور ان کی اولادیں یکساں طور پر حق پائیں گی، (زندگی اور موت دونوں شکل میں)

البتہ اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ یہ عبرتناک سزا کا مستحق بنانے والا جرم ہے کہ بس خواہش نفس پورا کرنے تک تو مرد کا عورت سے تعلق رہے اس کے بعد اس کی کوئی ذمہ داری اس پر نہ رہے چاہے اسکے نتیجہ میں عورت پر کچھ بھی گذر جائے۔

ہاں! اگر کوئی مرد کسی عورت سے جنسی خواہش کی تکمیل چاہتا ہے تو وہ باقاعدہ اس سے شرعی طریقہ پر عمر بھر کے لیے نکاح کا تعلق قائم کرے۔ اور تمام ذمہ داریاں قبول کرے چند بیویاں رکھنے کے جواز میں خود عورت کے لیے بھلائی کے بہت سے پہلو ہیں، جن کا ذکر طوالت کا موجب ہوگا۔[1]

آخری بات

جیسا کہ تمام باخبر جانتے ہیں کہ اس وقت ''یکساں سول کوڈ'' کا مسئلہ سپریم کورٹ کے دو ججوں کے فیصلہ کی وجہ سے ابھرا ہے، اس سے پہلے بھی دو مرتبہ سپریم کورٹ کے ججوں کے فیصلوں میں یہ مسئلہ چھیڑا گیا تھا، حالانکہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کا مسئلہ عدالتی

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''معاشرتی مسائل''

دائرہ سے باہر ہے (جیسا کہ دستورِ ہند میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے) کیوں کہ یہ ''راہنما اصولوں'' کی فہرست میں ہے اور ''پرسنل لا'' پر عمل کرنے کی گارنٹی دستور کی رو سے ''بنیادی حقوق'' میں ہے، پھر بھی عدالتیں اس کی ترتیب الٹنے کی کوشش کر رہی ہیں یہ بہت فکر مند بنانے والی بات ہے کیونکہ اس کا تدارک بہت مشکل ہے، اس سے پہلے یہ مسئلہ صرف سیاسی پلیٹ فارموں سے اٹھتا یا اٹھایا جاتا تھا اور اس کا مقابلہ کرنا الکشنی سیاست کے دور میں نسبتاً آسان تھا، اس بنا پر صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ تمام ایسے مذہبی لوگوں کو جنہیں اپنا اپنا ''پرسنل لا'' عزیز ہے، چاہئے کہ اس کے تدارک کی راہیں ڈھونڈھیں بظاہر قابل عمل راستہ یہی ہے کہ سب مل کر مرکزی حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ دستور کی دفعہ ۴۴ کو (جس سے یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی تحریک ہوتی ہے) خارج کر دے تاکہ یہ خطرہ ٹل جائے اس کے علاوہ اس کی گنجائش بھی ختم کر دے کہ ریاستی حکومتیں اس میں ترمیم کر سکیں۔ یہاں ایک سوال یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی سفارش کرنے والوں سے کیا جانا ضروری ہے، وہ یہ کہ آخر ان کے سامنے کون سا وہ آئیڈیل ''سول کوڈ'' ہے جسے تمام اہل ملک پر نافذ کرنے کیلئے سوچ رہے ہیں؟ سچ پوچھئے اور تعصب کی عینک ہٹا کر دیکھئے تو وہ صرف اسلامی قوانین کا مجموعہ ہی ہوسکتا ہے جس میں انسانی فطرت کی پوری رعایت کی گئی ہے تو کیا یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے خواہش منداسے نافذ کرنے پر تیار ہوں گے!!۔

شریعت کے ازدواجی قوانین میں عورتوں کے حقوق

انسان کی فطری ضرورتوں اور طبعی تقاضوں میں سب سے اہم۔ یا اہم ترین میں سے ایک وہ تقاضا ہے جس کی تکمیل ازدواجی رشتہ سے ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ اس جیسے اہم تقاضے کو کوئی معمولی سا قوانین کا مجموعہ بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ احکم الحاکمین کی طرف سے عطا کردہ وہ دستور، جو پوری انسانیت اور اس کے ہر ہر تقاضے کی رعایت اپنے اندر لئے ہوئے ہے، وہ بھلا کس طرح اسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ (**اَلاَ یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ**)۔

قرآن وسنت میں نکاح سے متعلق احکام کی تفصیلات

شریعت نے اس تقاضہ کو کتنی اہمیت دی ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اور کسی انسانی، شخصی وعملی، ضرورت کے لیے اتنے مفصل اور واضح احکام وہدایات قرآن و سنت میں نہیں ملتے جتنے اس کے بارے میں ملتے ہیں، پھر فرائض و واجبات (یعنی قانونی حیثیت رکھنے والے امور) کے اظہار و بیان پر ہی مشتمل وہ ہدایات نہیں ہیں بلکہ مستحبات و مندوبات (ترجیحی اور نسبۃً بہتر پہلوؤں) کی نشاندہی بھی ان میں بکثرت موجود ہے، یہ بجائے خود اس موضوع کی اہمیت اور عنداللہ مطلوبیت کی مستقل دلیل ہے، یہ قوانین قرآن مجید اور صحیح احادیث میں صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔ کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہیں۔ چنانچہ نکاح وطلاق سے متعلق قرآن مجید کی چھ سورتوں۔ بقرہ، نساء، نور، احزاب، ممتحنہ، طلاق۔ میں

تقریباً تیس آیتوں کے اندر احکام دیئے گئے ہیں، اسی طرح وراثت کے بارے میں بھی تفصیلی قوانین قرآن مجید کی سورہ نساء کے پورے ایک رکوع میں یکجا بیان ہوئے ہیں اس کے علاوہ اور بھی مواقع پر۔ مثلاً سورہ نساء کے آخر میں بتائے گئے ہیں، زوجین کے حقوق و فرائض کی تفصیلات بھی متعدد سورتوں (بقرہ، نساء، احزاب، طلاق وغیرہ) میں مذکور ہیں، اور ایسی احادیث کا تو شمار ہی مشکل ہے جن میں مذکورہ بالا مسائل بیان ہوئے ہیں ــــ تو اب خدانہ کردہ یونیفارسول کوڈ نافذ کیا جاتا اور ''مسلم پرسنل لا'' جزواً یا کلاً ختم کیا جاتا ہے تو اس اقدام سے قرآن مجید کی چالیس سے زیادہ آیتوں اور سینکڑوں احادیث کو عملاً معطل و منسوخ کرنے اور ان سب پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو جبراً محروم کرنے کا خطرہ لاحق ہوجائے گا۔ کیا کوئی بھی غیرت دار اور مسلمان یہ جبر و ظلم گوارہ کرنے پر آمادہ ہوگا، اور اگر بالفرض کوئی مسلمان اسے گوارہ کرتا ہے تو وہ مسلمان رہ سکے گا! ظاہر ہے کہ ــــ قرآن مجید کی آیات کی اتنی بڑی تعداد اور بکثرت احادیث کی منسوخی و معطّلی کو خوش دلی سے برداشت کر لینے والا مسلمان نہیں رہ سکتا۔

یہ بات کسی معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے سے بھی مخفی نہیں ہوگی کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے مسلمانوں کا امتیاز باقی نہیں رہے گا اور مسلمان، مسلمان کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتا ہے یعنی اگر یہ امتیاز ختم ہوگیا تو مسلمان یہاں بحیثیت مسلمان کے ختم ہوجائیں گے اور اکثریت کے اندر ایسے ضم ہوجائیں گے کہ تمیز نہ ہوسکے گی۔ چاہے نام مسلمانوں جیسا رہے، پھر آگے چل کر نام کے بھی مسلمان نہیں رہ جائیں گے جیسا کہ اسپین وغیرہ میں یہ صورت سامنے آچکی ہے۔ (لا قدر اللّٰہ)

رہا یہ پروپیگنڈہ کہ ''اسلامی قوانین غیر منصفانہ ہیں اور ان میں عورت کو نظر انداز کیا گیا ہے'' سراسر بے بنیاد ہے۔ اسلام نے عورتوں کو اتنے حقوق دیئے ہیں کہ کسی بھی مذہب یا قانون نے نہیں دیئے، اس کا کچھ اندازہ زیر نظر سطور سے ہوجائے گا۔

یہاں ان سب کا احاطہ نہ مقصود ہے اور نہ آسان، کیونکہ تمام تفصیلات، کسی مقالہ میں

نہیں ضخیم کتاب میں ہی سما سکتی ہیں۔ بحمد للہ اس موضوع پر متعدد مفید کتابیں موجود ہیں (راقم سطور کی کتاب ''معاشرتی مسائل'' بھی اسی طرح کے موضوع پر عرصہ ہوا سامنے آچکی ہے، جس کے متعدد ایڈیشن ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوچکے ہیں) بلکہ صرف ازدواجی رشتہ قائم ہوجانے کے بعد اسے خوشگوار طریقہ اور بہتر طور پر نباہنے کے لئے جو ہدایات و تعلیمات قرآن وسنت میں ہمیں ملتی ہیں ان کا مختصر تذکرہ اس وقت پیش نظر ہے۔

ایک فریق کا عقد نکاح میں نازک ہونا

اس حقیقت سے انکار آج بھی ممکن نہیں کہ اس رشتہ (یا عقد و معاہدہ) میں ایک فریق فطری طور پر کمزور و نازک ہوتا ہے (اس صنف کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے حدیث نبویؐ میں اسے ''قوارٍ'' (آبگینہ یعنی شیشہ) کہا گیا ہے۔[1] دوسرا، نسبۃً مختلف اعتبارات سے مضبوط اور طاقتور، اور سب جانتے ہیں کہ طاقت ور کا کمزور کو حق دینا۔ حیوانی طبیعت کے مطابق آسان نہیں ہوتا، جو بیدار مغز شخص بھی اسلامی تعلیمات و ہدایات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گا اس کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ دونوں کے فطری فرق کی پوری پوری اس میں رعایت کی گئی ہے۔ لیکن کسی صنف یا مجموعہ کی رعایت پر مشتمل قوانین و ہدایت کا تنہا مرتب و معلوم ہوجانا پورے قانونی حقوق دلانے کے لیے عموماً کافی نہیں ہوا کرتا (جس کی سب سے نمایاں اور واقعاتی مثال اقلیتوں کے حقوق ہیں کہ اگرچہ بہت سے ملکوں کے دستور انہیں برابر کے حقوق دیتے ہیں۔ مگر عملاً کیا ہوتا ہے؟ اسے بتانے کی ضرورت نہیں!)

وجہ ظاہر ہے کہ اپنی ذات پر جبر کر کے یا نقصان اٹھا کر ضعیف کی رعایت کرنے پر آسانی سے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، جب تک کسی کا خوف یا کوئی لالچ نہ ہو۔ دنیاوی قوانین بالخصوص ایسے قوانین کہ جن پر عمل کرنے میں مادی نقصان یا طبیعت پر جبر ہوتا ہو، عمل پر آمادہ

[1] دیکھئے، بخاری ج ۲ ص ۹۱۷، مسلم ج ۲ ص ۲۵۵

کرنے میں بالکل ناکام ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر ایسی شکل میں جہاں قانونی چارہ جوئی اور مظلوم کی دادرسی کا امکان بھی بہت کم ہو، (اور یقیناً زوجین کے حقوق و معاملات اصلاً اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں جن کا کسی بھی غیر کے سامنے بیان کرنا تک باعث ننگ، بلکہ بسا اوقات تباہ کن، بالخصوص عورت کے حق میں ہوتا ہے) تو بجز خوف خداوندی کے اور کوئی ایسا مؤثر عامل نہیں، جو کسی ضعیف کا حق دینے پر طبیعت کے نہ چاہنے بلکہ بار خاطر ہونے اور مادی نقصان کی صورت میں بھی طاقتور کو مجبور کر سکے۔

خطبہ نکاح میں حکمت؟

غالباً اسی وجہ سے رشتۂ ازدواج کے انعقاد یعنی نکاح کے وقت جو خطبہ (اتباع سنت میں) پڑھا جاتا ہے اس میں قرآن مجید کی وہ تین آیتیں پڑھنا مسنون ہے جن میں ''تقویٰ'' (یعنی خوف خدا کا، نیز اس کے بتائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی سے بچنے کا حکم ہے اور ان میں جو آیت سب سے پہلے پڑھی جاتی ہے (**یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ الخ**) اس کے اندر تو خوف خدا کے حکم کے ساتھ یہ بات بھی بتادی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت دونوں کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے، جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک، انسان ہونے کے لحاظ سے برابر ہے (یعنی قوت وصنعت کے فرق کے باوجود) اس لیے کسی کو کمتر سمجھنا نہ صرف ظلم بلکہ خلاف حقیقت اور انسانیت سے بعید ہوگا۔[1]

---

[1] راقم سطور اپنی کتاب ''معاشرتی مسائل'' (دین فطرت کی روشنی میں) کے اندر ان مسئلوں پر بھی مفصل کلام کر چکا ہے، تفصیل کے طالب کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، خطبۂ نکاح میں پڑھی جانے والی آیتوں میں سب سے پہلی سورۃ ''النساء'' کی پہلی آیت ہے، ''**یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ الخ**'' دوسری سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پردہ، عورت کی فطرت کا تقاضا

یہ طبعی بات ہے کہ نازک چیز یا جسم کے نازک حصہ کی رعایت سب سے زیادہ ہوتی ہے، مثلاً اس پر سخت بوجھ نہیں لادا جاتا اور نہ کسی ایسے کام کی انجام دہی اس سے متعلق کی جاتی ہے جو اس کے ضعف و نزاکت کے لحاظ سے ناقابل تحمل ہو، سچ پوچھئے تو عورت کو حجاب کا حکم دینے میں اسی وصف (نزاکت) کی رعایت ہی مقصود ہے۔ کیونکہ نازک اور قابل احترام چیز کی رعایت و حفاظت زیادہ کی جاتی ہے، اگر عورت واقعی حقیقت شناس ہو اور اپنی قدر پہچان لینے کی صلاحیت رکھتی ہو تو اس کے نزدیک سب سے بہتر چیز ''اجانب کی نگاہوں سے اپنی حفاظت ہوگی'' جیسا کہ خاتون جنت (بلکہ جنتی عورتوں کی سردار) حضرت فاطمہؓ نے اپنے والد معظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس سوال کے جواب میں کہ ''عورت کے لئے سب سے بہتر چیز کیا ہے''؟ فرمایا تھا ''نہ وہ کسی اجنبی مرد کو دیکھے اور نہ اسے کوئی اجنبی مرد دیکھے''۔

اخراجات کا عورت پر کوئی بار نہیں

اس لئے شریعت نے کوئی ایسی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی جو اصل فطرت کے لحاظ سے اس پر بار ہو، چنانچہ شریعت نے اس پر نفقہ کی (خود عورت کے اپنے نفقہ کی بھی) ذمہ داری عام حالات میں نہیں ڈالی، اس بارے میں شریعت کا قانون یہ ہے کہ عورت کا

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) **یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ الخ**، تیسری سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۰ **یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً الخ**، شاید اسی ضعف و نزاکت کی وجہ سے اولاد کو اللہ سچے رسول کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ وہ حسن سلوک کرنے میں ماں کو مقدم رکھے (باپ کے مقابلے میں بھی) بخاری ج ۲ ص ۸۸۳۔

(شادی سے قبل) نفقہ اس کے والد پر ہے۔[1] والد نہ ہونے یا اخراجات برداشت کرنے کے لائق نہ ہونے کی صورت میں حسب اصول وراثت، دادا، چچا، بھائیوں وغیرہ پر۔ مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی وفات کی صورت میں جس وارث کو شرعی طور پر جتنا حصہ مل سکتا ہے اسی نسبت کے بقدر اس عورت کے (موجودہ شکل میں) متوقع وارث پر اخراجات لازم ہوں گے۔

منافع ذمہ داریوں سے وابستہ

اس سے شریعت کے ایک اور حکیمانہ اصول کا پتہ چلتا ہے کہ اس میں منافع کو ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔

---

[1] عورت کے نفقات کے سلسلہ میں خاصی تفصیلات براہ راست کتاب وسنت میں بھی موجود ہیں، اسی کی روشنی میں فقہائے کرام نے مزید وضاحت وترتیب سے انھیں بیان کردیا ہے، دیکھئے قرآن مجید (مثلاً سورہ بقرہ آیت ۲۳۳ وسورہ طلاق آیت ۶۰۱، کتب حدیث میں دیکھئے مثلاً بخاری ثانی ۸۰۶، ۸۰۷ ومسلم ثانی ۳۶، ۵۷، ۳۱۲۔ فقہ حنفی (شریعت اسلامی) کی مشہور ومعتبر کتاب درمختار اور اس کی شرح ردالمحتار میں ہے۔ تجب النفقة (هي الطعام والكسوة والسكنى) لزوجة على زوجها ولو صغيراً... او فقيراً... وتجب لمطلقة الرجعي والبائن والفرقة بلا معصية ... النفقة والسكنى والكسوة... لمعتدة موت مطلقاً... وتجب لولده الكبير العاجز عن الكسب كالانثىٰ مطلقا (فمجرد الانوثة عجز الا اذا كان لها زوج... انه ليس للأب ان يوجرها في عمل او خدمة)... لو لم يقدر إلا على نفقة أحد والديه فالام احق... و تجب ايضا لكل ذي رحم محرم صغيراً أو انثى مطلقا ولو كانت الانثى بالغة... يقدر الارث و يجبر عليه الخ (نوٹ) نفقہ کا باب بہت طوالذیل ہے مذکورہ بالا کتاب (ردالمحتار) کی جلد ثانی میں ۶۴۳ سے ۶۸۹ تک پھیلا ہوا ہے) خلاصہ یہ کہ عورت پر ہنگامی اور نادر حالات کے علاوہ اور کوئی ایسا وقت نہیں آتا کہ اس پر نفقہ کی ذمہ داری ہو۔ اس انتظام کی موجودگی میں مطلقہ کے نفقہ کی ذمہ داری سابق شوہر پر ڈالنا ظلم کہلانے کی مستحق ہے۔ جیسا کہ سی۔ آر۔ پی کی دفعہ ۱۲۵ میں ڈال دی گئی ہے۔) شامی ج ۲ ص ۶۸۱، ۲۸۲

شادی کے بعد عورت کے اخراجات شوہر پر لازم ہوتے ہیں۔ شوہر سے علیٰحدگی کی صورت میں بھی، عدت کے درمیان پورے اخراجات شوہر کے ذمہ ہیں، یہاں تک کہ اگر بیوی کھانا پکانے کی عادی نہ ہو تو پکا پکایا کھانا مہیا کرنا شوہر کے ذمہ ہوگا، یا باورچی کا انتظام کرنا ہوگا، اور شیر خوار بچہ کی موجودگی میں عدت کے بعد بھی جب تک بچہ کا دودھ نہ چھوٹے اس کے اور بچے کے اخراجات شوہر کے ذمہ ہیں، بچہ کا دودھ چھوٹنے کے بعد بھی اس کی پرورش کرنے کی وجہ سے اگر وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کرتی اور بچہ کی پرورش میں مشغول رہتی ہے، تو پوری مدت کے درمیان (جو لڑکے کے لئے تقریباً سات سال اور لڑکی کے لئے بلوغ تک ہے) اس کا اور بچہ کا خرچ بچہ کے باپ کے ذمہ رہے گا، مزید یہ کہ باپ، بچہ کی ماں کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کرسکتا۔[1] الّا یہ کہ بچہ کی جان یا صحت کو خطرہ ہو، اگر ماں دودھ پلانے پر راضی نہ ہو تو باپ کو دوسری دودھ پلانے والی عورت کا انتظام کرنا پڑے گا، (اگر وہ خوش حال ہو) عدت کے بعد اولاد پر، اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں پھر شادی سے قبل کی طرح والد یا دیگر قریبی رشتہ داروں پر ہے، اور جن لوگوں پر عورت کے اخراجات لازم کئے گئے ہیں وہ محض رضا کارانہ نہیں بلکہ قانونی طور پر واجب ہیں۔ یعنی اس کے لیے ان لوگوں کو مجبور کیا جائیگا اور قانوناً ان سے دلوایا جائے گا۔ شوہر اگر خوش حال ہے تو اس کی حیثیت کے مطابق بیوی کو اخراجات دلوائے جائیں گے۔ اور (عورت کو بعض شکلوں میں) ان کی طرف سے حکومت قرض بھی دلوا سکتی ہے۔ بدقسمتی سے اگر عورت کے رشتہ دار بھی نہ ہوں (یا اس لائق نہ ہوں) نیز اور بھی کوئی معقول ذریعہ معاش نہ ہو تو پھر اس کے نفقہ کی ذمہ داری حکومت وقت پر ہے۔ (شرعی حکومت نہ ہونے کی صورت میں جماعت مسلمین اس کی قائم مقام ہوتی ہے) خلاصہ یہ کہ عورت کو اپنی ضروریات زندگی کے واسطے کمانے کی محنت ومشقت سے ہمیشہ کے لیے بچایا اور اس کا تکفل اکثر کسی نہ کسی مرد کے ذمہ کردیا گیا

---

[1] احکام القرآن للجصاص۔ ج ۱ ص ۴۰۸

ہے۔اس کی وجہ بھی ''آ بگینہ'' کی رعایت کے سوااور کیا ہوسکتی ہے!

ترکہ میں عورت کا حصہ کم کیوں؟

یہیں سے ترکہ میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ سے (اکثر صورتوں میں) کم ہونے کی حکمت بھی معلوم ہوجاتی ہے، کہ عورت پر عام ونارمل حالات میں ایسی کوئی مالی ذمہ داری شرعاً عائد ہی نہیں ہوتی کہ وہ خرچ کرنے پر مجبور ہو، مزید برآں، مرد کے برخلاف عورت کو نکاح کرنے کی صورت میں مہر بھی ملتا ہے، جو اکثر خطیر رقم ہوتی ہے۔ پھر بھی اس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری شوہر ہی پر ہوتی ہے۔اس طرح عورت، ترکہ میں حصہ بظاہر کم پانے کے باوجود زیادہ کی مالک بن جاتی ہے۔مثلاً اگر کوئی مورث ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث چھوڑ جائے اور تیس ہزار روپیہ کا ترکہ، تو لڑکے کو بیس اور لڑکی کو دس ہزار روپے ملیں گے۔ پھر اس کے بعد اگر لڑکا اور لڑکی دونوں شادی کریں اور فرض کیجئے ہر ایک کا مہر دس دس ہزار مقرر ہوا تو لڑکے کے پاس مہر کی رقم نکالنے کے بعد دس ہزار روپے رہ جائیں گے، اور لڑکی کو شوہر کی طرف سے مہر کی رقم مل جانے کے بعد اس کے پاس بیس ہزار ہوجائیں گے۔ مزید یہ کہ لڑکے کو اپنے ذاتی اخراجات کے ساتھ اپنی بیوی کے اخراجات بھی اٹھانا ہوں گے۔اور لڑکی پر کوئی خرچ نہیں خود اس کا اپنا بھی نہیں، کیوں کہ وہ بھی اس کے شوہر کے ذمہ ہوگا، اس طرح عورت، ترکہ میں حصہ ابتداءً کم پانے کے باوجود بالآخر زیادہ مال کی مالک ہوجاتی ہے، جو فی الواقع اس کے بینک بیلنس بڑھانے کا ہی ذریعہ ہوگا، کسی حقیقی ضرورت پر خرچ کرنے کی نوبت شاید ہی آسکے گی! پھر عورت اسلامی شریعت کے مطابق شادی سے قبل کی طرح شادی کے بعد بھی نہ صرف اپنے والدین (اور بعض صورتوں میں بھائی بہن وغیرہ) کے ترکہ میں شریک ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے شوہر اور اولاد کی میراث میں سے بھی حصہ پانے کی مستحق ہوتی ہے۔اسی بناء پر بہت سے حقیقت پسند اور منصف مزاج

باخبر غیر مسلم مفکرین بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ ''اسلامی قوانین میں عورتوں کو جتنے حقوق دیئے گئے ہیں وہ کسی بھی قانون میں نہیں دئے گئے۔''[1]

تعجب کی بات

لیکن تعجب ہے کہ ان شرعی قوانین کو جن میں عورتوں کو اتنے حقوق اور رعایتیں دی گئی ہیں، جو کسی بھی ملکی یا مذہبی قوانین میں نہیں دیئے گئے ہیں۔حقوق نسواں کی پامالی کرنے والا ٹھہرایا اور کہا جارہا ہے۔اور اس کے مقابلہ میں ایسی تہذیب ومعاشرت کو عورت کے حقوق کا نگہبان اور ان کی عزت افزائی کرنے والا قرار دیا جارہا ہے۔جس نے اسے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بسوں کی کنڈکٹر اور دکانوں کی سیل گرل ہی نہیں بنایا بلکہ کال گرل جیسی لعنت میں گرفتار کیا اور مردوں کی تفریح طبع کے لیے بے پردہ کرکے اسے شمع انجمن بنایا اور جس کی برہنہ اور نیم برہنہ تصویروں کو بازاری سامان کی طرح ہر گلی کوچے میں نیلام ہی نہیں، رسوا کیا جارہا ہے۔اس کے باوجود یہ تہذیب عورت کی محسن وخیر خواہ ہے! ع

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد

شوہر پر بیوی کے حقوق

عورت کی صنفی رعایت ہی کا احترام ولحاظ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مردوں کو خاص طور پر حکم دیا ہے **وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ** (سورہ نساء آیت ۱۹) یعنی اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر طریقہ پر زندگی گذارو، اور اللہ کی کتاب کے اسی کی طرف سے شرح وتفصیل کرنے والے سچے رسولؐ نے حسنِ معاشرت کا قولی ہی نہیں عملی طور پر ایسا نمونہ پیش کیا جس سے زیادہ بہتر کا تصور کرنا بھی ہے۔سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے

---

[1] حوالہ کے لیے دیکھئے اجلاس احمد آباد اکتوبر ۹۵ء میں پڑھا گیا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کا خطبہ صدارت

اسی سلسلہ کے یہاں چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اسوۂ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے کام کاج میں ازواج کا ہاتھ بٹاتے تھے'' اس کی تشریح زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہؓ نے (کہ جن سے زیادہ، گھریلو زندگی کے بارے میں معتبر شہادت کسی اور کی نہیں ہوسکتی) یہ فرمائی کہ آپؐ اپنے کپڑے صاف کر لیتے، بکری کا دودھ دوہ لیتے، کپڑے خود سی لیتے، چپل درست کر لیتے، اور ڈول کی مرمت کر لیتے۔'' آپؐ نے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہؓ کی دل جوئی کی خاطر ان کے ساتھ بھاگ دوڑ میں مقابلہ بھی کیا، اور ان کی کم عمری کی وجہ سے انہیں سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی، پھر آپؐ کا یہ کریمانہ برتاؤ صرف حضرت عائشہؓ کے ساتھ ہی مخصوص نہ تھا بلکہ ایسا ہی برتاؤ کم وبیش تمام ازواج کے ساتھ تھا۔ بیوی کے ساتھ رعایت اور حسن سلوک کا آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی وفات کے بعد بھی خیال رکھا جائے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زوجۂ اولیٰ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات کے بعد بھی انہیں برابر یاد فرماتے ان کے حق میں دعائے خیر کرتے اور یہ معمول بھی تھا کہ کبھی بکری ذبح کر کے اس کے گوشت کی بڑی مقدار آں مرحومہ (رضی اللہ عنہا) کی سہیلیوں کو بھیجواتے'' اسی بنا پر ازواج مطہرات کا متفقہ فیصلہ تھا کہ آپؐ بحیثیت بہترین شوہر کے بھی بے نظیر وعدیم المثال تھے، آپؐ نے امتیوں کو بھی عورتوں (اپنی بیویوں) سے میٹھے انداز میں گفتگو کرنے کا حکم دیا بلکہ (شوہروں سے) یہ بھی فرمایا کہ بقدرِ امکان حلیہ بھی تم بہتر بنائے رکھو جیسا کہ تم چاہتے ہو کہ عورتیں تمہارے لئے سنگار کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ازواج کے ساتھ خود کریمانہ برتاؤ کیا اسی طرح اپنی امت کے مردوں سے بھی مطالبہ کیا کہ وہ بھی اپنی بیویوں کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کریں، اگر خصوصی طور پر اس کی تاکید نہ بھی کی جاتی تب بھی نبی اکرمؐ کی اتباع کے

عام حکم کا تقاضہ یہی ہوتا، لیکن اس کے باوجود خصوصیت کے ساتھ آپؐ نے مختلف موقعوں اور متعدد پیرایۂ بیان میں اس بارے میں تاکیدیں اور نصیحتیں فرمائیں۔ مثلاً ایک موقع پر عورت کی فطری وخلقی کمزوری کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی کوتاہیوں سے صرف نظر کرنے کا حکم دیا، یعنی یہ کہ عورت کی طرف سے کچھ کوتاہی ہو جانے کے باوجود (جس میں وہ فطری طور پر معذور سی ہے) اس کے ساتھ بہتر سے بہتر معاملہ کرتے رہو۔ برکت وبصیرت کے لئے اصل کلمات طیبات پڑھتے چلیں: **استوصوا بالنساء خیراً**۔[1] عورتوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنے کے (بارے میں میری) نصیحت مانو'' (یہ ایک طویل حدیث کا مختصر حصہ ہے، اس سے پہلے حصہ میں وہ بات فرمائی گئی ہے جو ابھی مذکور ہوئی)۔

عورت کی رعایت

غور فرمایئے اس صنف کے ساتھ کس درجہ رعایت کا حکم دیا جا رہا ہے کہ عورت سے اگر ناگواری پیدا کرنے والی حرکات سرزد ہوں تو بھی تحمل کا ثبوت دو اور اس میں اسے معذور گردانتے ہوئے بہتر سے بہتر سلوک کرتے رہو۔ تکلیفیں سہتے رہنے کے باوجود کریمانہ برتاؤ کرتے رہنے پر ذہن کو بھی مطمئن کرنے کے لیے یہ ارشاد فرمایا۔ ''**لایفرک مومن مومنة ان کرہ منها خلقا رضی منها آخر**''[2] یہ دراصل قرآن مجید کی ایک آیت **عسیٰ اَن تَکْرَھُوْ شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْراً کَثِیْراً** کی تشریح ہے) یعنی کوئی شوہر اپنی بیوی سے تعلقات (کسی ایک آدھ ناگوار بات کی بناء پر) ایک دم منقطع نہ کر لے۔ کیونکہ اس کی کوئی بات اگر ناگوار ہوئی ہے تو کچھ باتیں اس میں ضرور پسندیدہ بھی ہوں گی! غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اس طرح غور کرنا کس درجہ مؤثر ہوگا؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں! آں حضرتؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ بندہ کو ایمان میں کمال اسی وقت حاصل ہوگا، جب

---

[1] بخاری شریف ج ۱ ص ۴۶۹۔ [2] صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۷۵۔

حسن اخلاق میں وہ انہتائی بلند درجہ پر پہونچ جائے، یہ بھی فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر وہ مسلمان ہے جو اپنی (خداترس) بیوی کی نظر میں بھی بہتر ہو، **قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکمل المؤمنین ایمانا أحسنھم خلقا وخیارکم خیارکم لنساء ھم** [1] ان ہدایات کا یہ اثر ہوا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو بسروچشم قبول کرنے والوں نے عورتوں کے واجب حقوق ادا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی دلجوئی اور رعایت میں اس حد تک چلے گئے جس سے زیادہ کا تصور بھی مشکل ہے، جس کی ایک نمایاں مثال حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے طرز عمل میں ملتی ہے۔ جسے وہ خود ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں ''**إنی لا تزین لامرأتی کما تتزین لی، بقولہٖ تعالیٰ**'' **وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْف** '' [2] یعنی میں اپنی بیوی کی خاطر بنا سنورا رہتا ہوں جیسا کہ وہ میری خاطر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔شوہر کے بیوی پر جیسے حقوق ہیں ویسے ہی بیوی کے شوہر پر بھی ہیں، صنف نازک کی دلداری اور رعایت کا آخری درجہ یہ ہے کہ جب نباہ نہ ہوسکنے کی بنا پر مجبوراً طلاق کی نوبت آجائے اور علیٰحدگی ضروری ہوجائے تو ایسے نازک وقت میں بھی اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:۔**وَسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ـــــــ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحاً جَمِیْلاً** '' [3] یعنی بیویوں سے علیحدگی بھی خوش اسلوبی اور اچھے طریقہ سے اختیار کرو۔

ایک بے نظیر حکم

دنیا کے قوانین شاید اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ بلکہ انسانی نفسیات کی تاریخ میں غالباً یہ حکم نوادر میں شمار کئے جانے کے لائق ہو، کہ ایسی حالت (طلاق کے

---

[1] ترمذی ج۱ ص۱۳۸۔ [2] بحوالہ تفسیر المنار ج ۲ ص ۳۷۷۔ از علامہ رشید رضا مصری۔
[3] سورۃ البقرۃ ۲۳۱ والاحزاب ۴۹

وقت) میں جبکہ عموماً دونوں طرف انتقامی جذبات کی آگ بھڑک رہی ہوتی ہے اور نفرت عروج پر ہوتی ہے، قرآن حکیم میں مرد کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ وہ عورت کے تمام واجب حقوق ادا کرنے کے ساتھ مزید کچھ تحفہ کے طور پر بھی اسے دے (**وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْف**) تاکہ اس کی دل شکنی کی تلافی ہو۔

گذشتہ صفحات میں عورت کے مرد پر حقوق، یا عورت کے ساتھ رعایت کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ قانونِ شریعت میں عورت کو ہر ذمہ داری سے بری، اور شوہر کو اپنی بیوی کی صرف ناز برداری کرنے اور اس کی تمام مناسب و نامناسب فرمائشوں کی تکمیل کا ہی حکم دیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ حکیم وخبیر کے عطا کردہ قوانین اور نبی فطرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایات اس درجہ غیر حکیمانہ اور غیر متوازن کیونکر ہوسکتی ہیں کہ جس سے معاشرتی نظام ہی برباد ہوکر رہ جائے، جو اس رشتہ کا اصل مقصد ہے۔

اسلام کا ایک حکیمانہ اصول

اصل واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں عموماً ہر فریق کو اس کی ذمہ داریاں اور فرائض بتا کر انہیں پورا کرنے پر زور دیا گیا ہے، جس کے نتیجہ میں ہر ایک کے حقوق بھی مل جاتے ہیں اور اطمینان بھی نصیب رہتا ہے، جس سے انتہائی خوشگوار طریقہ پر نباہ ہوتا ہے، یہی طریقہ اس بارے میں بھی اختیار کیا گیا ہے جس سے نہایت اعلیٰ درجہ کا توازن واعتدال پیدا ہوگیا ہے۔

عورتوں کے حقوق اور مردوں کے فرائض کا ذکر ہوجانے کے بعد مناسب ہوتا کہ مردوں کے حقوق اور عورتوں کے فرائض کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کا مختصر تذکرہ بھی کردیا جاتا مگر اختصار کے پیش نظر ایسا نہیں کیا جارہا ہے، البتہ اتنی بات کا ذکر

ناگزیر معلوم ہورہا ہے کہ دونوں کی زندگی ایسی صورت میں خوشگوار رہ سکتی ہے کہ جب دونوں طرف سے ایک دوسرے کی رعایت ہو یعنی صرف قانونی اور واجبی حقوق وفرائض کی ادائیگی ہی پر اکتفا نہ ہو بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر یگانگت کا برتاؤ ہونا چاہئے، اس موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا ایک حکیمانہ قول (جو خود راقم نے ایک نکاح کے موقع پر سنا ہے) نقل کرنا مفید ہوگا وہ یہ کہ ''میاں بیوی کے درمیان ضابطہ کا نہیں رابطہ کا تعلق ہونا چاہئے'' قرآن حکیم کے اندر ایک موقع پر زوجین کے باہمی تعلق کو ''**هُنَّ لِبَاس لَكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ** '' (یعنی تمہارے لیے (بمنزلِ) لباس ہیں اور تم ان کے لئے) کے بلیغ ومعجزانہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

زوجین کے روابط کی بلیغ تمثیل

مشہور انشاء پرداز عالم ومفسر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے بصیرت افروز اور ادیبانہ انداز میں آیت بالا پر جو نوٹ لکھا ہے جی چاہتا ہے کہ اسے پیش کردیا جائے، مولانا لکھتے ہیں:۔

''قرب واتصال کے لحاظ سے ایک دوسرے کے پردہ دار، اور موجب تسکین ہونے کے لحاظ سے گویا اردو محاورہ میں دونوں میں ''چولی دامن کا ساتھ'' ہے، وہ ان کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ اُن کے حق میں ....غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں لباس کا ایک وصف امتیاز اس کی پردہ پوشی ہے، لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے اس کے حسن کو ابھارتا ہے.......... گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہئے اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا .... جتنا موقع ایک دوسرے کے جسمانی، اخلاقی، روحانی، عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے اتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو..........اس صورتحال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہ ہے

کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے، اس پر صبر کرے اسے بہتر سے بہتر صورت حال میں ظاہر کرے اور ع ''ناخوشِ تو خوش بود بر جانِ من'' کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے۔ علی ہذا۔ مرد کے بھی کمالِ اخلاق کی معراج یہی ہے۔ دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بتادیا۔ یہ اس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی ''محققین'' کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔ ع

''کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا''

رعایت نرمی و ہمدردی پر مبنی یہ اسلامی قوانین اور نبویؐ ہدایات اور عملی اقدامات صرف بیٹیاں تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ پوری صنفِ نازک ان کریمانہ و ہمدردانہ عنایات کے دائرہ میں آجاتی ہے، سب واقف جانتے ہیں کہ قبل از اسلام عرب میں لڑکیوں کی پیدائش باعث شرم اور منحوس سمجھی جاتی تھی، لڑکی کا باپ مارے شرم کے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اس کا چہرہ اتر جاتا تھا چنانچہ وہ اس ''عار'' سے بچنے کے لیے زندہ لڑکی کو مٹی میں دبادیتا تھا (قرآن مجید کی سورۃ النحل میں اس کی پوری تصویر کشی کردی گئی ہے) نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کی پیدائش کو باعث خیر وبرکت بتایا اور ان کی پرورش ونگہداشت پر جنت کی خوش خبری سنائی، فرمایا:۔ جو شخص لڑکیوں کی بہترین طریقہ پر تربیت اور اچھا برتاؤ کرے گا وہ جہنم میں نہ جائے گا (بخاری) اور فرمایا: جو شخص دو، تین بہنوں یا لڑکیوں کی بہتر انداز میں پرورش کرے اور کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے وہ جنت میں جائے گا اور اللہ کے رسول کے ساتھ (جنت میں) اتنا قریب ہوگا جتنا ایک ہاتھ کی دو انگلیاں ہوتی ہیں۔

لڑکی کے بارے میں زمانہ جاہلیت اور اسلام میں فرق

اس شوق انگیز انداز بیان کے بعد بھلا کون سچا مسلمان ہوگا جو لڑکیوں اور بہنوں کی پرورش وتربیت خوش دلی سے نہیں کرے گا، ان تعلیمات کا ایک اثر یہ ہوا کہ غیر شادی

شدہ لڑکی کو (اسی عرب میں جہاں لڑکیاں زندہ دفنادی جاتی تھیں) وہاں ''کریمہ'' (معزز اور لائق صد احترام لڑکی) کہا جانے لگا، اور نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر بھی ان سے کریمانہ برتاؤ کیا جانے لگا اور آج تک مسلم معاشرہ میں۔ پوری دنیا کے اندر بالعموم ان کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جارہا ہے، جبکہ (افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) بعض غیر اسلامی معاشروں میں لڑکیوں کے ہلاک کرنے کی جاہلی قدیم رسم مختلف شکلوں میں پھر زندہ کی جارہی ہے اور اس کے لئے نت نئے طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں جن کے ذریعہ حالت حمل میں ہی اندازہ ہو جانے کے بعد اسقاط کرادیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ صنف نازک ہی کی ایک فرد ماں ہے، جس کے احترام اور عزت کی بابت اسلامی ہدایات کا احاطہ کرنا ہی مشکل ہے، آخری بات یہ ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے جنت بتائی گئی ہے، اس سے زیادہ بلند مرتبہ کا تصور بھی مشکل ہے جو اسلامی تعلیمات میں ماؤں کو دیا گیا ہے پھر بھی اسلام پر عورت کی بے عزتی کرنے کا الزام کیا درست قرار دیا جاسکتا ہے؟!